شکست سے خوابناک فتح تک طالبان کی کہانی اپنی زبانی

دوران جنگ اور جنگ کے بعد دشمن کی اصل آواز شاید ہی کبھی سنائی دیتی ہے۔ شیخی بگھارنے کیلئے پروپیگنڈہ تو بہت زیادہ کیا جاتا ہے جیسا کہ افغانستان میں امریکی اور اتحادی کرتے رہے مگر دوسری طرف تلخ حقیقت یہ ہے کہ طالبان اس وقت تیزی سے جدید جنگی مہارت حاصل کررہے ہیں۔ معمولی جنگجوئوں کے اندھے ایمان اور اولوالعزمی نے نئی اور جدید جنگی تھیوریز کو شکست کے ملبے تلے دبا دیا ہے۔ اس بات کی سچائی عراق اور افغانستان میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ افغانستان میں 8 برس کی طویل جنگ کے بعد فوجی اس حد تک تھک چکے ہیں کہ امریکیوں اور ان کے اتحادیوں کو یہ تک نہیں پتا کہ ان کے دشمن کون ہیں اور ان کی جنگ کس کے ساتھ ہے۔ افغانستان کی جدید جنگ اور طالبان کی امریکہ کے ہاتھوں پہلے ہولناک شکست اور پھر بے مثال فتح کی یہ حیرت انگیز کہانی طالبان کے چند موجودہ کمانڈروں کی زبانی بیان کردہ ہے۔ ان طالبان کمانڈروں سے امریکی جریدے نیوز ویک کے نمائندوں نے علیحدہ علیحدہ انٹرویوز کئے، انہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ امریکہ کے حملے کے وقت طالبان کے ساتھ کیا ہوا اور پھر اس کے بعد کا خوفناک عرصہ کیسے گزرا۔ دوبارہ سے ہمت یکجا کر کے امریکہ کے خلاف جنگ شروع کرنے سے لے کر کامیابی حاصل کرنے تک کی کہانی جس طرح طالبان کمانڈروں نے سنائی، اسی طرح قارئین کے لئے پیش ہے۔ یہ انٹرویوز سمیع یوسف زئی نے کئے جو نیوز ویک نامی امریکی جریدے کے لئے 2001 سے افغانستان میں رپورٹنگ کررہے ہیں اور بہت سے طالبان کمانڈروں کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔

نیوز ویک کے نمائندے ”رون موریے“ کے ساتھ کام کرتے ہوئے یوسف زئی نے ایک ماہ سے زیادہ کا وقت پاک افغان بارڈر کے نزدیک افغانستان میں کئی ایسے لوگوں سے ملاقات کی جو بعد میں طالبان سے رابطے کا ذریعہ بنے، ان میں سے کچھ لوگوں کو یوسف زئی پہلے سے جانتا تھا اور یہ قابل بھروسہ لوگ تھے۔ طالبان کی یہ کہانیاں عام لوگوں کو ایک غیر معمولی ہمت دیتی ہیں جس سے آپ ان افغان جنگجوئوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ طالبان کے

زوال سے لے کر عروج تک کی یہ کہانی اس وقت سامنے آرہی ہے جب وہ افغانستان میں دوبارہ عروج حاصل کر چکے ہیں اور امریکہ اور اتحادیوں نے شکست تسلیم کر لی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

طالبان کا زوال:

مولوی عبدالرحمن آخوندزادہ اس وقت طالبان کے ایک کمانڈر تھے جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا۔ ان کا کہنا ہے بم ہمارے آدمیوں کو اس طرح کاٹ رہے تھے جیسے کوئی کسان پکی ہوئی گندم کی فصل کاٹتا ہے، ہم بے بسی سے دیکھ رہے تھے کہ بم آتا کہاں سے ہے اور اس سے کیسے بچا جائے۔

افغانستان پر امریکی حملے کے وقت حقانی بھی ایک طالبان کمانڈر تھا۔ اس کا کہنا ہے 11 ستمبر کو امریکہ میں حملوں سے دو دن قبل ہم لوگ شمالی اتحاد کے کمانڈر احمد شاہ مسعود کی موت کا جشن منا رہے تھے جس کو القاعدہ کے ایجنٹ نے ٹی وی رپورٹر کے روپ میں جا کر قتل کر دیا تھا۔ اس کی فوج بھی مسلسل شکست کا شکار تھی اور اس کے مرنے کے بعد اس بات کا امکان تھا کہ افغانستان میں طالبان کو مکمل فتح مل جائے گی۔ مگر ایک اور آفت اب ہمارے سر پر کھڑی ہو گئی تھی۔ ہمیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ امریکی بدلہ لینے کیلئے ہم پر ضرور حملہ کریں گے۔ خطرے کو بھانپتے ہوئے میں نے جلد از جلد اپنی بیوی اور بچوں کو پاکستان بھیج دیا۔ طالبان حکومت بھی گرنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ طالبان حکومت اتنی جلدی امریکی بم حملوں کے نتیجے میں ڈھیر ہو جائے گی۔ ہر کوئی اپنی اور اپنے پیاروں کی جان بچانے کی کوشش میں تھا۔ جس وقت بمباری شروع ہوئی میں نے اپنے سر سے پگڑی اتاری اور ایک پرانے شلوار قمیص میں ملبوس ہو کر پاکستان کی طرف نکل گیا۔ میں نے پیدل پہاڑوں کو سر کیا اور چوٹی پر پہنچ کر افغانستان کی طرف پلٹ کر کہا، "اے افغانستان اب تیرا اللہ ہی حافظ ہے۔ شاید اب میں زندگی بھر دوبارہ تجھے نہ دیکھ سکوں، اب میں اسی وقت لوٹوں گا جب یہاں دوبارہ اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی" یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

طالبان کا ایک اور کمانڈر، آخوندزادہ بتاتا ہے کہ جس وقت بمباری شروع ہوئی میں 400 جنگجوؤں کی کمانڈ کر رہا تھا اور ہم مزار شریف کے محاذ پر لڑ رہے تھے۔ بم ہمارے آدمیوں کو اس طرح کاٹ رہے تھے جیسے کوئی کسان پکی ہوئی گندم کی فصل کاٹتا ہے۔ بم پھٹنے کی وجہ سے مجاہدین طالبان کے ناک اور کان سے خون جاری تھا۔ ہم مرنے والوں کو دفنا بھی نہیں سکے کیونکہ جو کوئی خندقوں میں چھپا ہوا تھا وہ وہیں دب کر مر گیا۔ میں نے اپنے آپ کو سرنڈر نہیں کیا، میں اپنے بچے کچے ساتھیوں کو لے کر وہاں سے پریشانی کی حالت میں نکلا۔ اس علاقے میں ہر شخص ہمارے خلاف ہو چکا تھا۔ کابل کے جنوب میں جانے والی سڑک پر واقع سالانگ سرنگ بند کر دی گئی تھی، ہم مسلسل 4 دن برف میں بغیر کچھ کھائے پئے چلتے رہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے دشمن قبیلوں کے بچے تک جانوروں کی طرح ہمارا شکار کرنے لگے۔ مسلسل چلتے رہنے کے بعد پانچویں دن میں نے اپنے ہتھیار چھپائے اور ایک گائوں میں جا کر ان کو بتایا کہ میں مسافر ہوں اور راستہ بھٹک گیا ہوں، انہوں نے مجھے کچھ کھانا دیا مگر جب میں دوبارہ اس جگہ آیا جہاں اپنے

ساتھیوں کو بٹھا کر گیا تھا تو وہ لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ میں نے اس گائوں سے آگے چلنا شروع کیا تو کچھ دور جا کر ایک سڑک پر مجھے ایک منی بس آتی دکھائی دی۔ میں نے ڈرائیور پر بندوق تانی اور بس رکوائی۔ بس طالبان سے بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ بس میں بلکل بھی جگہ نہیں ہے لہذا وہ مجھے نہیں بٹھا سکتے یہ سب وہ طالبان تھے جو جان بچا کر فرار ہو رہے تھے۔ میں نے ان کو دھمکی دی کہ اگر مجھے بس میں نہیں بٹھایا تو میں بس کے ٹائر کو گولی مار کر پنکچر کر دوں گا۔ اس دھمکی پر انہوں نے مجھے بس میں سوار کر لیا۔ مجھے بس کے فرش پر لیٹنا پڑا کیوں کہ بس میں کہیں اور جگہ ہی نہیں تھی۔ اس طرح باقی لوگوں کی ٹانگیں میرے اوپر تھیں۔ یہ بہت ہی تکلیف دہ سفر تھا، مگر میں اس سارے سفر میں قدرے گرم ماحول میں رہا۔ اگلی صبح کابل قندھار ہائی وے کی ایک چیک پوسٹ پر ہمیں مقامی جنگجوئوں نے دھر لیا۔ ہم مرنے کے بلکل قریب تھے ہمارے گلے پیاس سے سوکھنے اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمنے کی وجہ سے خون جاری تھا اور مجھے لگتا تھا کہ قیامت بپا ہو گئی ہے۔ ان لوگوں نے ہمیں ایک جیل میں بھیج دیا میں ان کی غلیظ جیل میں ایک ماہ تک مقید رہا، پھر ایک پشتون کمانڈر نے مجھے عید سے پہلے رہا کر دیا اور کہ تم میرے پشتون بھائی ہو اس لئے رہا کر رہا ہوں۔ میرے اندر جتنی بھی قوت تھی اس کے سہارے میں پشاور تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہماری اسلامی ریاست 40 دن کی امریکی بمباری سے ختم ہو چکی تھی، مجھے کبھی اس پر یقین نہیں آیا حالانکہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہوا تھا مگر پھر بھی میں سوچتا تھا کہ شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں اور یہ سچ نہیں ہے۔ لیکن یہ سچ تھا، پھر میں اپنے دل کو تسلی دیتا تھا کہ للہ ہمیں دوبارہ سے عروج بخشے گا صرف اس وجہ سے کہ ہم نے اس کی راہ میں اپنا بہت خون بہایا ہے۔ مگر کیسے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

خان نامی شخص، افغانستان پر امریکی حملے کے وقت طالبان نہیں تھا، وہ افغان صوبے غزنی کے ایک گائوں کی مسجد کے پیش امام کا بیٹا تھا جس نے کبھی جہاد میں شرکت نہیں کی تھی۔ اس کا کہنا ہے امریکی حملے اور طالبان کی پسپائی کے بعد عرب، چیچن اور طالبان نے اپنے گھروں اور مسجدوں سے کاروں، ٹرکوں اور پک اپس میں وزیرستان کی طرف بھاگنا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ان پر امریکیوں نے بمباری شروع کر دی تو انہوں نے گاڑیوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں پیدل سفر شروع کر دیا۔ ان کے ساتھ زخمی بھی تھے۔ کچھ زخمی طالبان اور عربوں نے، جن کے ساتھ ان کے خاندان، عورتیں اور بچے بھی تھے، انہوں نے غزنی کے قریب ہماری مسجد میں قیام کیا۔ دوسرے گائوں والوں نے امریکہ کے ڈر سے ان کی مدد سے انکار کر دیا تھا اور ان سے لوٹ مار کرنا چاہتے تھے مگر میری غیرت نے مجھے للکارا اور میں اپنی بندوق لے کر ان کی حفاظت کے لئے کھڑا ہو گیا۔ صرف میں اور میرے والد نے ان کے طعام کا بندوبست کیا اور انہیں کھانا بھی کھلایا۔

☆☆☆☆☆☆☆

اسی طرح ایک اور افغان باشندے، یونس کا کہنا ہے کہ جب میں بچہ تھا تو میرے والد مجاہدین کے کمانڈر تھے اور انہوں نے روس کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا، ہماری حفاظت کیلئے انہوں نے مجھے اور میرے خاندان کو وانا میں قائم افغان مہاجر کیمپ میں بھیج دیا تھا۔ 1996ء میں روس کی شکست کے بعد میرے والد طالبان حکومت میں کابل میں کسی سرکاری عہدے پر فائز ہو گئے تھے مگر میں اور میرے گھر والے وانا میں ہی تھے۔ ہم لوگ مدرسے اور اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ اکثر چھٹیوں میں وانا سے ان کو ملنے کیلئے کابل جاتا تھا۔ امریکی حملے کے بعد طالبان کی اسلامی حکومت کا ختم ہونا کسی خوفناک خواب سے کم نہیں تھا، اس وقت میں وزیرستان کے شہر وانا میں ہی تھا۔ افغانستان سے بھاگ کر جان بچا کر بہت سے طالبان یہاں چلے آئے

تھے، ان میں زخمی اور معذور بھی تھے۔ میں معذور، زخمی اور شکست خوردہ طالبان کو ہر روز سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہوئے دیکھتا تھا ان میں عرب، چیچن اور ازبک بھی شامل تھے، ان کے پاس نہ تو رہائش تھی اور نا ہی کھانے کو کچھ تھا، کچھ کے ساتھ تو ان کے بیوی اور بچے بھی تھے۔ ہر صبح اسکول جاتے ہوئے میں ان کو آبادی کے آس پاس بے گھر بھکاریوں کی طرح پھرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ یہ لوگ کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے بس بے بسی سے ہر ایک کو دیکھتے رہتے تھے۔ پھر تھوڑا تھوڑا کر کے لوگوں نے ان کی مدد کرنا شروع کی اور انہیں کھانا دینا شروع کیا۔ کچھ لوگ تو ان کو اپنے گھروں میں بھی لے گئے اور انہیں مہمان بنا کر اپنے گھر میں ٹھہر الیا اور اپنا نصف گھر ان کے حوالے کر دیا اور انہیں اپنا بھائی قرار دے دیا۔ اس سے یہ تاثر ملا کہ ابھی جہادی زندہ ہیں۔ اس وقت وزیرستان میں عرب مجاہدین طالبان سے بہت ناراض تھے کیونکہ اب وہ جنگ میں شامل ہونے کیلئے تیار نہیں تھے، طالبان کا کہنا تھا کہ امریکہ کے ساتھ لڑنا ممکن نہیں ہے اور جب یہ پتہ ہی چلتا کہ بم آیا کہاں سے، اور دشمن ہے کہاں تو کیسے لڑا جائے؟ عرب مجاہدین کہتے تھے کہ بیوی اور بچوں کو وزیرستان میں اللہ کے سپرد کر کے خود اپنے ہتھیار جمع کر و اور دوبارہ افغانستان میں امریکیوں پر حملے کرنے چلو اب وہ زمین پر آ گئے ہیں۔ عربوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنی آخری سانس تک لڑنا چاہتے ہیں۔ دراصل بات یہ تھی کہ افغان طالبان بہت پریشان اور مایوس تھے، ان کے دل ٹوٹ چکے تھے، وہ کہتے تھے کہ ہم نے اپنے خون سے سیر اب کر کے ایک اسلامی مملکت بنائی تھی جو اس طرح آسانی سے ختم ہو گئی۔ حالانکہ ہم نے پوری ایمانداری سے اپنا خون بہایا مگر شاید اللہ نے اسے قبول نہیں کیا، طالبان کا کہنا تھا کہ انہوں نے تو اپنا ملک ہی کھو دیا ہے جب کہ عربوں کا کہنا تھا کہ ٹھیک ہے ہم ایک جنگ ہار گئے ہیں مگر اب نئی جنگ کی تیاری کر و اور پچھلی جنگ کی شکست کو ہی نہ روتے رہو۔ ہم جب تک زندہ ہیں روز ایک نئی جنگ لڑنے کی تیاری کریں گے اور اس پر عمل کریں گے، یہاں تک کہ ہم مر جائیں اور ہمارے بعد والے اس پر عمل کریں۔

☆☆☆☆☆☆☆

مسیح الدین بھی طالبان کے زوال کا عینی شاہد تھا، اس کا کہنا ہے کہ جب طالبان زوال پذیر ہوئے تو میں نورستان میں ایک مدرسے میں پڑھتا تھا۔ طالبان حکومت ختم ہونے کے بعد میں نے اپنی پڑھائی پاکستان میں جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ مگر 2002ء میں پاکستانی صدر پرویز مشرف نے ایک نیا قانون متعارف کرایا جس کے تحت مدرسوں میں غیر ملکی طالب علموں کے داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ میں نے پشاور کے نزدیک ایک مسجد میں قیام کیا اور صورتحال بہتر ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ میرے ساتھ 10 طالبعلم اور بھی تھے۔ ہم مسجد کے ساتھ بنے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے جہاں بجلی نہیں تھی۔ ہمیں پڑھنے اور خاص کر سونے کیلئے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کھانے کیلئے بھی ہمیں باہر جانا پڑتا تھا مگر کوئی بھی گائوں والا ہمیں کھانا کھلانے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ آئے دن پولیس ہمیں ہراساں کرتی رہتی تھی۔ ہم نے طالبان کی واپسی کی دعائیں مانگنا شروع کر دیں، ہمیں طالبان کی فتح کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی مگر ہم پھر بھی ان کی واپسی کی دعائیں مانگتے رہتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

طالبان کی شکست کے بعد جب کمانڈر حقانی فرار ہو کر پاکستان پہنچا تو اس کے والد، بھائی اور باقی خاندان والے مانسہرہ میں تھے۔ یہاں اور بھی افغان خاندان مہاجر کیمپوں میں مقیم تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے سوچا کہ اگر ان کے ساتھ میں بھی جا کر مہاجر کیمپ میں رہنا شروع کر دوں تو یہ ٹھیک

نہیں ہو گا کیونکہ اکثر لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ کئی لوگ مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں اور کئی کے دلوں میں طالبان کیلئے کوئی اچھے جذبات نہیں ہیں وہ مجھے گرفتار کرا دیں گے۔ میں وہاں قریب میں ایک مسجد میں جاکر چھپ گیا۔ آدھی رات کے وقت چوروں کی طرح مجھے کیمپ میں جاکر اپنے بیوی بچوں سے ملنا پڑتا تھا۔ ایک رات میں اپنی بیٹی سے ملنے کیمپ میں گیا تو اس نے کابل والے گھر کے بارے میں پوچھا اور کہنے لگی کہ ہمارے پاس گاڑی کیوں نہیں ہے۔ مجھ سے شکایت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ یہاں کیمپ میں بہت گرمی ہے اور وہ واپس کابل کے ٹھنڈے ماحول میں جانا چاہتی ہے۔ مگر وہ میری آنکھوں سے میرے درد کا اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کہ میں اندر سے بری طرح سے ٹوٹ چکا تھا اور اس کیلئے کتنا پریشان تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

طالبان کمانڈر آخند زادہ کا کہنا ہے کہ طالبان ملائوں اور جنگجوئوں نے جب اپنے لباس تبدیل کیے تو وہ کسی کی پہچان میں نہیں آئے۔ کوئی بھی طالبان کے طور پر پہچان نہیں کرانا چاہتا تھا۔ وہ دوست اور رشتہ دار جو میرے کمانڈر ہونے پر میری عزت کرتے تھے انہوں نے بھی مجھ سے منہ پھیر لیا۔ میرے پاس نا تو پیسے تھے اور نا ہی کرنے کیلئے کوئی کام اور میں بلکل ہار چکا تھا۔ میں نے اپنے خاندان کو افغانستان سے دور پنجاب میں لاکر بسا دیا۔ میں نے جب کام ڈھونڈنا شروع کیا تو مجھے کوئی کام پر رکھنے پر راضی نہیں تھا کیونکہ کسی کو میری زبان نہیں آتی تھی، میں واپس پشاور آگیا اور یہاں آکر میں نے سبزی بیچنا شروع کر دی۔ میرے پاس کچھ پیسے جمع ہونا شروع ہوگئے مگر میں اب تک جنگ ہارنے کے صدمے سے نہیں نکل پایا تھا، میری بیوی نے مجھے بتایا کہ میں سوتے میں روتا رہتا ہوں اور اپنے ساتھیوں کو پکارتا رہتا ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے مجھے کچھ دوائیاں لکھ کر دے دیں۔ میں اس حد تک آپے سے باہر ہو گیا تھا کہ اکثر گاہک کو ٹماٹر کے بجائے آلو دے دیتا تھا، اکثر دن کو بیٹھے بیٹھے رونا شروع کر دیتا، مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ہم جنگ ہار چکے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

ملا آغا خان محمد کا کہنا ہے کہ طالبان کا زوال میرے جہادی طرز زندگی کا سبب بنا۔ دوسرے ملائوں کی طرح میرے والد بھی خاصے پریشان تھے۔ طالبان کے دور میں میرے والد صاحب بااختیار تھے مگر طالبان کے جانے کے بعد ان کی طرف بہت کم لوگ ہی توجہ کرتے تھے۔ میرے والد اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ ان کو فالج کا اٹیک ہو گیا جس سے ان کا آدھا جسم مفلوج ہو گیا۔ 2002ء کے آخر میں افغان پولیس نے غزنی میں ہماری مسجد پر ریڈ کی، وہ میرے والد کو گھسیٹ کر گائوں والوں کے سامنے لے گئے اور طالبان کا ساتھ دینے پر برا بھلا کہنے لگے۔ انہوں نے میرے والد پر بہت دبائو ڈالا کہ وہ طالبان کے ہتھیاروں کے ٹھکانوں کا بتائیں۔ ان کی بہت بے عزتی کی گئی اور جیل میں ڈال دیا گیا جس وقت ان کو جیل میں لے جایا گیا ان کی عمر 70 برس تھی۔ اس بے عزتی پر ہمارے دشمن بھی ہمارے ہمدرد بن گئے اور کہنے لگے کہ اب زندہ رہنے سے مرنا بہتر ہے۔ ہمارے کچھ خیر خواہوں نے پولیس میں جاکر رپورٹ درج کرا دی۔ جو لوگ کچھ مہینے پہلے ہمارے خلاف تھے وہ اب ہمیں سپورٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے پولیس میں شکایت کی کہ افغان اہکاروں نے مسجد کی حرمت کو پامال کیا اور جوتوں سمیت مسجد میں داخل ہو گئے، ایک بوڑھے اور کمزور سے شخص پکڑ کر جیل میں ڈال دیا، جو کہ مسجد کا امام ہے۔ پھر 2003ء کے شروع میں میرے والد وفات پا گئے۔ مرتے وقت ان کے آخری الفاظ تھے " ہائے طالبان۔

ہائے اسلامی حکومت"۔

میں اس وقت کافی چھوٹا تھاتب بھی پولیس نے مجھے دومرتبہ گرفتار کیاایک دفعہ میرے گھر سے اور دوسری مرتبہ مسجد میں سے، وہ مجھ سے پوچھ گچھ کرتے تھے اور اتنے بے وقوفی والے سوالات پوچھتے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ وہ مجھ پوچھتے تھے کہ طالبان کہاں ہیں؟ انہوں نے اپنا اسلحہ کہاں چھپایا ہے؟ میرے گھر والوں نے موٹر بائیک بیچ کر میری ضمانت کرائی۔ پولیس نے میرے بھائی کو بھی گرفتار کیا جو کہ ایک اسکول ٹیچر تھا۔ حتا کہ پولیس نے میرے ڈسٹرکٹ کے ایک 90 برس کے پیش امام کو بھی گرفتار کرکے ان کے ساتھ بدتمیزی کی۔ ان واقعات کی وجہ سے لوگوں کے رویوں میں تبدیلی آرہی تھی اور اس کا ایک سبب مسجد اور ملاؤں کے ساتھ برا سلوک بھی تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

وزیرستان کے شہر وانا کے یونس کا کہنا تھا کہ پہلے پہل میں نے افغانیوں سے کبھی یہ نہیں سنا کہ وہ دوبارہ جنگ کیلئے تیار ہیں بلکہ عرب خود تو اس بارے میں مستعد تھے اور وہ افغانیوں اور مقامی قبائلیوں کو بھی غیرت دلاتے رہتے تھے۔ شروع کے ایک دو برسوں میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور طالبان اور دیگر قبائلی اپنی شکست تسلیم کرکے خاموش ہو کر بیٹھ گئے ان کا خیال تھا کہ اب قیامت قریب ہے کیونکہ امریکہ کا مقابلہ کرنا ممکن ہی نہیں اور اللہ نے اپنے وعدے کے مطابق فرشتے بھی نہیں بھیجے، ان کے پاس جان اور خون تھا جس کے دریا انہوں نے بہادئے مگر کچھ نہیں ہوا اس لئے اب قیامت کا انتظار کیا جائے تاکہ اللہ خود انصاف کردے۔ پھر اس کے بعد کچھ عربوں نے مل کر ٹریننگ کیمپس کو فعال کرنا شروع کیا۔ پہلا ٹریننگ کیمپ جس کے بارے میں سنا گیا وہ وانا کے نزدیک شن ورسک گائوں کے قریب تھا۔ میں طالبان کی شکست کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کرسکا تھا، جب میں نے سنا کہ عربوں نے کوئی ٹریننگ کیمپ قائم کیا ہے اور وہ امریکہ سے لڑنے کے لئے دوبارہ تیاری کررہے ہیں، اس وقت تک سب لوگ جہاد اور طالبان کو ماضی خیال کرکے صبر کرچکے تھے مگر میں نے فیصلہ کرلیا کہ اسکول کی چھٹیوں میں خود وہاں جاکر دیکھوں گا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہاں ایک نہیں دو تین کیمپ چل رہے تھے جن میں سے ایک عرب مجاہدین کا تھا جبکہ باقی چیچن اور ازبک مجاہدین چلارہے تھے۔ ان کیمپوں میں لوگ تھے اور وہ پرجوش تھے کہ اپنی زندگی میں ایک بار پھر امریکیوں پر حملے کرنے جائیں گے، میں یہ دیکھ کر خوشی سے رو پڑا کہ اب بھی ایسے کچھ لوگ ہیں جو امریکہ سے دوبارہ جنگ لڑنے کی تیاری کررہے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ میری جان بھی حاضر ہے مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کرلیں۔ میرے مدرسے کے استادوں کا شکریہ کہ جن کی وجہ سے میں نے عربی سیکھی جس سے کیمپ میں تربیت کے دوران میں نے مصری، یمنی، لبنانی اور سعودی لڑکوں سے دوستی کرلی۔ کمانڈر نیک محمد وزیر (جو کہ ایک پاکستانی قبیلے کہ فرد تھے اور طالبان کے لیڈر تھے ان کو 2004ء میں ایک ڈرون حملے میں شہید کردیا گیا تھا) انہوں نے عربوں کو اپنے علاقے میں پناہ دی اور ان کو اتنا بہادر بنادیا کہ وہ بغیر کسی سکیورٹی کے مختلف گائوں میں گھومتے پھرتے رہتے اور جہاں کوئی اسلحے کی سپلائی دکھائی دیتی اس کو لوٹ لیتے تاکہ امریکیوں پر حملے میں اسے استعمال کرسکیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اپنی تعلیم چھوڑ کر طالبان میں شامل ہو جائوں۔

☆☆☆☆☆☆☆

ملا آغا محمد بھی ایک افغان ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میرے والد 1994ء میں وفات پاگئے اور مجھے میری ماں اور بہن بھائیوں کی ذمہ داری سونپ گئے۔ میرے پاس ملا عمر موومنٹ میں شامل ہونے کا وقت نہیں تھا۔ کئی برسوں تک مجھے اس بات کا افسوس رہا کہ میں جہاد میں شامل نہیں ہو سکا۔ 2001ء میں طالبان کے زوال کے بعد پشاور کی جس مسجد میں، میں پیش امام تھا وہاں بہت سے زخمی آئے۔ مجھ سے اکثر نمازی پوچھتے تھے کہ میں نے جہاد میں حصہ کیوں نہیں لیا۔ میں نے اپنے جواب سے ان کو خاموش کرا دیا، میں ان سے اکثر یہی سوال کرتا تھا کہ اب کون سے مجاہدین لڑ رہے ہیں جن کا ساتھ دیا جائے، کوئی بھی میرے اس سوال کا خاطر خواہ جواب نہیں دے سکا۔ مگر دل میں اپنے آپ کو ضرور لعن طعن کرتا تھا کہ میں کیوں جہاد میں شریک نہیں ہوا۔ پھر ایک دن میں نے ایک نوجوان افغان کا نام سنا، عزیز اللہ جو کہ اس وقت افغانستان کی بگرام جیل میں مقید ہے۔ میں اس کے گھر گیا اور اس سے امریکیوں کے خلاف جہاد میں شامل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مگر وہ مجھ سے جھوٹ بولنے لگا اور کہنے لگا کہ اس کا جہاد سے کوئی تعلق نہیں وہ تو ایک غریب لڑکا ہے۔ ایک دن میں نے اس کو مسجد جاتے ہوئے دیکھا تو اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ اب بھی گھبرایا ہوا لگ رہا تھا مگر آخر کار وہ میری مدد کرنے پر راضی ہو گیا۔ اس نے مجھے وزیرستان کے قریب ایک تربیتی کیمپ میں بھیجا اور ساتھ میں ایک تعارفی خط بھی دیا جس سے مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی اور میں ان مجاہدین تک پہنچ گیا جو امریکیوں پر حملوں کی تیاری کر رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حقانی کا کہنا ہے کہ 2003ء کے شروع میں، میں اور میرے خاندان نے پشاور کے نزدیک ایک کرائے کے گھر میں رہائش اختیار کر لی۔ یہ 2001ء میں طالبان کی شکست کے بعد سے پہلا موقع تھا کہ میں باقاعدہ کسی گھر میں رہائش پذیر تھا۔ میں نے اپنا خاص طالبان کا لباس بھی پہننا چھوڑ دیا تھا، پھر اچانک طالبان کے وزیر دفاع ملا عبید اللہ میرے گھر تشریف لائے۔ وہ عجیب شکل میں تھے، داڑھی چھوٹی کر لی تھی اور فیشن والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ 2001ء کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ طالبان کے کسی بڑے عہدیدار سے میری ملاقات ہو رہی تھی، انہیں زندہ اور اپنے سامنے دیکھ کر میں رو پڑا۔ وہ ان دنوں پورے پاکستان میں طالبان کے بکھرے شیرازوں کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھے۔ ان کی محنت کی وجہ سے طالبان کی آدھی سے زیادہ لیڈرشپ دوبارہ فعال ہو چکی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ہم لوگ دوبارہ سے جہاد کیلئے افغانستان میں جا رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ ناممکن ہے اور ہم امریکیوں سے نہیں لڑ سکتے، روس کی بات اور تھی مگر اب امریکی بم تو نظر بھی نہیں آتے۔ پھر بھی انہوں نے مجھے یقین دلایا اور اپنی مدد کرنے کیلئے راضی کر لیا۔ انہوں نے مجھے دو ہفتے بعد اپنی بتائی ہوئی جگہ پر ملنے کو کہا۔ دو ہفتے بعد میں جب مقررہ جگہ پر پہنچا تو حیران رہ گیا کہ میٹنگ میں افغان جہاد کے مرکزی کردار موجود تھے۔ سابق طالبان وزیر اور فوجی کمانڈر سب ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور آپس کے سب جھگڑوں کو بھلا کر امریکیوں سے لڑنے کو تیار تھے، یہ سب لوگ شرمندہ تھے کہ آخر وہ کیوں زندہ بچ گئے، اگر وہ بھی امریکی بموں سے مارے جاتے تو کم از کم یہ ذلت تو نہ دیکھنے کو ملتی، اب یہ سب لوگ ایک بار پھر ہمت اور ہتھیار جمع کر کے افغانستان جانے کو تیار تھے۔ ملا عبید اللہ نے مجھے بتایا کہ ہمیں آپ کی بیوروکریٹ اور وزیر کی حیثیت سے کوئی ضرورت نہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ سے جتنا ہو سکے مجاہدین کو تیار کر کے میدان جنگ (افغانستان) میں لے کر آئیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

آخند زادہ اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک دن ایک شخص سبزی خریدنے کیلئے آیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ وہ ایک طالبان کمانڈر تھا اور شمالی افغانستان میں کئی سالوں تک بر سرپیکار رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اسی طرح سبزیاں فروخت کرتے رہو گے یہ پھر سے جہاد پر چلنے کا ارادہ ہے۔ میں اس وقت 2000 روپے روزانہ کمار ہا تھا مگر دل انتہائی غمگین تھا اور ہر روز طالبان حکومت اور شرمناک شکست کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اگر دوبارہ سے جہاد شروع ہو تو میں پھر سے شامل ہو جاؤں۔ جب اس کمانڈر نے مجھے بتایا کہ میں دوبارہ سے جہاد میں شامل ہو سکتا ہوں تو میں فوری طور پر راضی ہو گیا۔ اسی رات میں ایک میٹینگ میں شرکت کیلئے گیا جو کہ پشاور کے نزدیک کسی مقام پر منعقد کی گئی تھی۔ میری اس وقت حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے اپنے بڑے بڑے کمانڈروں کو وہاں زندہ پایا۔ ملا داداللہ جو کہ میرے لئے ایک مثالی کردار تھے اور ان کا نام ہی فتح کیلئے کافی تھا وہ اپنی ایک ٹانگ کے ساتھ وہاں موجود تھے اور امریکیوں کو حیرت انگیز گالیاں دیتے ہوئے سب کو شرم دلا رہے تھے کہ ہم جان بچا کر فرار ہو گئے اور اسلامی حکومت ختم ہو گئی مگر ہم نے بدلہ نہیں لیا۔ میرا سبزی فروشی میں سارا دھیان یک دم ختم ہو گیا۔ اس میٹنگ کے چھ مہینے بعد مجھے میران شاہ بلایا گیا، جہاں ملا داداللہ پہلے سے موجود تھے (ان کو 2007ء میں شہید کر دیا گیا)، ملا اختر محمد عثمانی (ان کو دسمبر 2006ء میں شہید کیا گیا) اور ملا عبید اللہ (ان کو مارچ 2007 میں پاکستانی فورسز نے گرفتار کر لیا تھا) بھی یہاں موجود تھے۔ اس میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر کمانڈر اپنے ساتھیوں کو تلاش کر کے ان کو دوبارہ تیار کرے گا، انہیں کیمپ میں لے جا کر تربیت دلائے گا اور پھر جہاد میں شامل ہو جائے گا۔ مجھے کوئٹہ بھیجا گیا جہاں میرے یونٹ کے طالبان نے پناہ لے رکھی تھی۔ میری کمانڈ میں کل 400 جنگجو تھے۔ کوئٹہ میں مجھے ان میں سے صرف 15 جنگجو ملے، باقی سب مارے جا چکے تھے، ان کو میں نے افغانستان میں جہاد کے بارے میں غیرت دلائی تو وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئے۔ یہ سب لوگ پہلے سے کافی شرمندہ تھے اور اسلامی حکومت کے خاتمے پر سخت بے چین بھی تھے مگر انہیں کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ شمالی وزیرستان میں ہم نے مزید ٹریننگ لی، نیا اسلحہ لیا اور نئے بندوں کو ساتھ لے کر کے افغانستان لوٹ گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

محمد آغا کا کہنا ہے: میں اپنے گھر والوں کو چھوٹے بھائی کے سپرد کر کے خود جنوبی وزیرستان چلا گیا۔ میرا سفر ایک مسجد پر ختم ہوا جو کہ ایک چھوٹے سے گائوں میں بنی ہوئی تھی جہاں ایک ملا نے عزیز اللہ کا دیا ہوا خط پڑھا اور مجھے اور اندر پہاڑوں پر کسی خفیہ مقام پر لے جانا شروع کر دیا جو کہ پوری طرح سے پہاڑوں، جھاڑیوں اور درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں جگہ جگہ چیک پوائنٹس بنے ہوئے تھے جن پر مسلح مجاہدین تعینات تھے جو کسی مقامی شخص کو بھی وہاں سے گزرنے نہیں دے رہے تھے۔ تھوڑا آگے جا کر ہمیں 30 کے قریب مسلح افراد نے روک لیا جن میں سعودی، یمنی اور مصری افراد شامل تھے۔ انہوں نے بہت سخت اور شک والے انداز میں مجھ سے سوالات کیے۔ ایک اور سینئر عرب نے میرا تفصیلی انٹرویو لیا، اس کا اصرار اس بات پر تھا کہ میں نے ملا عمر کی تحریک میں شامل ہو کر جہاد کیوں نہیں کیا۔ کچھ گھنٹوں بعد مجھے سب سے بڑے لیڈر کے پاس لے جایا گیا۔ ابو خباب المصری (یہ ایک سینئر القائدہ لیڈر اور بم بنانے کے ماہر تھے جو کہ جولائی 2008ء میں ڈرون اٹیک میں شہید ہو گئے تھے) بہت ہی خوش اخلاق

تھے دوسرے لیڈروں کی طرح خشک مزاج نہیں تھے۔ وہ میرے برابر میں زمین پر بیٹھ گئے اور مجھ سے اس جہاد کا حصہ بننے کا سبب پوچھنے لگے اور پوچھا کہ میں ان کی کس طرح سے مدد کر سکتا ہوں۔

بہت کم عرب اور دوسرے جہادیوں کو اس پہاڑی پر آنے کی اجازت تھی۔ یہاں پوری طالبان قیادت رہتی تھی۔ جو بڑے بڑے جہادی ستارے وہاں رہائش پذیر تھے، ان میں ابولیث اللیبی (ایک گوریلا وار ایکسپرٹ جنہیں جنوری 2008ء میں ڈرون اٹیک کے دوران شہید کیا گیا)، ابو ہمزہ رابیہ (ان کا شمار بھی القائدہ کے سینئر رہنمائوں میں ہوتا ہے، انہیں 2005ء کے آخر میں شہید کیا گیا) شامل تھے۔ وہاں پر خوراک اور پیسے اتنے نہیں تھے۔ مجھے یہی لگتا تھا کہ مجاہدین اس وقت مایوسی کا شکار ہیں مگر تھوڑے دنوں میں عرب، مقامی مجاہدین سے گھل مل گئے اور بہت جلد مقامی قبائیلوں کو کیمپ میں آنے کی اجازت مل گئی جس سے ہمیں وافر مقدار میں کھانا، پیسے اور دوسری ضروریات کا سامان ملنے لگا اور کچھ قبائیلوں نے تو ہمارے لئے اپنے گھروں سے مشین گنیں اور راکٹ لانچر تک لا کر دئے، وہ اس بات پر خوش تھے کہ عرب مجاہدین امریکیوں سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں اور ہمت ہارے نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

یونس اپنی کہانی آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ ہمارے کیمپ میں 150 کے قریب عرب اور تھوڑے افغان، چیچن اور مقامی قبائلی تھے۔ عرب مجاہدین ہمیں سکھاتے تھے کہ کلاشنکوف کیسے چلاتے ہیں، خاص کر کم فاصلے پر مار، کس طرح کرنی ہے۔ عرب استاد ہمیں دشمن کے بارے میں انٹیلی جنس جمع کرنا سکھاتے تھے اور مارٹرز اور راکٹ بھی چلانا سکھاتے تھے۔ یہاں ایک دوستانہ ماحول بن گیا تھا اور ہمارے درمیان ایثار کا جذبہ اس قدر تھا کہ ہم ایک دوسرے کیلئے اپنی جان نچھاور کرتے تھے۔ 2003ء کے شروع میں موسم تبدیل ہو گیا اور سخت سردی پڑنے لگی جس کی وجہ سے کیمپ بند کرنا پڑا۔ مگر مجھے کمانڈر نے مارچ میں دوبارہ بلا لیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مقامی قبائلی کمانڈر نیک محمد کے ساتھ کام کر رہے ہیں جس میں وہ پہلی دفعہ بارڈر پار جا کر امریکیوں پر حملہ کریں گے۔ نیک محمد کی مدد کے باوجود ہمارے پاس صرف 50 ہتھیار تھے جبکہ مجاہدین کی تعداد 200 کے قریب تھی جنہوں نے ٹریننگ لی تھی۔ اس لئے صرف پچاس مجاہدین، جن میں 2 درجن کے قریب عرب، تین چار افغان اور کچھ وزیری اور محسود قبائلی تھا اور ایک میں، ہم سب کو اسلحہ دے کر بارڈر پار، امریکیوں پر پہلے حملے کے لئے روانہ کر دیا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

محمد نے اپنی کہانی آگے بڑھاتے ہوئے بتایا کہ کیمپ میں، میں نے جو سب سے پہلی چیز سیکھی وہ گولی چلانا اور کلاشنکوف کی دیکھ بھال تھی۔ اس کے بعد ہمیں گوریلا جنگ اور گھات لگا کر حملے کی پہاڑوں پر دن رات مشق کراتے رہے۔ عربوں نے ہمیں کھاد اور ڈیزل فیول کی مدد سے دھماکہ خیز مواد بنانا سکھایا اور پھر اس کو ایک مکمل بم کی شکل میں لانا سکھایا، بم کے ساتھ ڈیٹونیٹرز اور موبائل فون کے ساتھ اس کو پھاڑنے کا طریقہ بھی سکھایا گیا۔ اس کے علاوہ ہمیں اس بم کو اندھیرے میں چھپانا بھی سکھایا گیا۔ وہاں کے اصول بہت سخت تھے اور جو، ان کی پیروی نہیں کرتا تھا اس کے ساتھ سختی برتی جاتی تھی۔ ہمیں صبح صادق سے پہلے جسمانی ورزش کیلئے جگا دیا جاتا تھا۔ ہمیں رات کو جاگنے کی بھی تربیت دی جاتی تھی تاکہ کسی حملے کی صورت میں ہم

فوری تیار ہو جائیں۔ میں نے اس طرح کے اصول و ضوابط افغان ٹریننگ کیمپوں میں نہیں دیکھے تھے۔ عرب کہتے تھے کہ اگر ہم سخت تربیت نہیں لیں گے تو اللہ بھی ہماری مدد نہیں کرے گا جیسا کہ امریکہ کے ساتھ مقابلے میں ہوا۔ دو ماہ کی سخت ترین ٹریننگ کے بعد ہمیں محاذ کیلئے اجازت دے دی گئی۔ ہمارے ساتھ کل 200 لڑکے تھے جن میں 40 کے قریب افغان، 160 مقامی قبائلی اور کچھ پنجابی لڑکے شامل تھے۔ ہم سب کو 10 گروپس میں تقسیم کر دیا گیا اور ہر گروپ کے ساتھ تین چار عربوں کو استاد کے طور پر ساتھ کر کے ہماری کمان سونپ دی گئی تھی۔ اس کے بعد ہم پورے افغانستان میں پھیل گئے کچھ خوست اور پکتیا صوبے میں چلے گئے اور کچھ کو غزنی اور قندھار بھیجا گیا۔ ہمارے تین گروپ باڈر کراس کرتے ہوئے امریکی بمباری کا شکار ہو گئے اور وہاں سے واپسی بھی خطرے سے خالی نہیں تھی۔ ہمیں جلدی سے بھاگنا تھا اور لوگوں کی نظروں سے چھپنا تھا، ہمیں ہدایت دی گئی تھی کہ کسی گائوں کے قریب نہیں جانا کیونکہ اس وقت سارے گائوں دیہات امریکہ کے اتحادی بنے ہوئے تھے اور ہر جگہ امریکہ کے مخبر پھیلے ہوئے تھے۔ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے پہلے پہاڑیوں میں جا کر چھپنا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

قاری یونس نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: اپریل 2003ء کی ایک رات ہم نے 5 پک اپ اور ایک بڑے ٹرک میں بارڈر کراس کیا، ان گاڑیوں میں ہم بارڈر کراس کر کے گاڑیاں واپس بھیج دیتے تھے تاکہ پیچھے آنے والے ان گاڑیوں کی مدد سے آ جائیں۔ اس دفعہ ہمارا ٹارگٹ ایک امریکی فوجی اڈہ تھا جو کہ بارڈر سے تھوڑی دور پکتیکا صوبے میں واقع تھا۔ ہم نے صبح صادق کے وقت حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے 30 منٹ تک مسلسل بیس پر 122 ملی میٹر کے راکٹ اور مارٹر برسائے مگر ہم پھر بھی ہم بیس کے قریب جانے میں ناکام رہے تاکہ ان پر کلاشنکوف سے حملہ کرتے، کیونکہ تھوڑی دیر میں ہی امریکی ہیلی کاپٹروں نے آ کر ہم پر راکٹوں کی برسات کر دی۔ قیامت کا منظر تھا، جس وقت ہم پر بمباری ہو رہی تھی میں نے بڑی مشکل سے اپنی جان ایک گڑھے میں چھپ کر بچائی، ہمارے 6 ساتھی شہید ہو چکے تھے جن میں دو عرب ایک افغان اور تین قبائلی تھے۔ میری سانس کافی دیر تک بحال نہیں ہوئی تھی۔ مگر ہمارے عرب استادوں نے کہا کہ بھاگنا مت، ایک بار پھر امریکیوں پر حملہ کرو تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ ان کی بمباری سے ہمارا کچھ نقصان نہیں ہوا، جو شہید ہو گیا، وہ بہتر جگہ چلا گیا، اس کی فکر مت کرو۔ ہم نے ایک بار اپنی ہمت جمع کی اور ایک بار پھر بھرپور حملہ کیا اور امریکی اڈے پر راکٹ برسائے پھر ہم نے پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کیا اور اپنے ساتھیوں کی کٹی پھٹی لاشوں کو اٹھا کر واپس وانا، پاکستان آ گئے۔ جب لوگوں کو پتہ چلا کہ طالبان امریکیوں پر حملہ کر کے آئے ہیں تو ہر طرف ایک دھوم مچ گئی اور سب ہمیں دیکھنے جمع ہونے لگے، کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ امریکیوں پر حملہ کرنے کے بعد ہم زندہ واپس آ گئے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں مقامی قبائلیوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی اور مجھے ایک اعزاز ملا کہ میں اتنے بڑے بڑے مجاھدین کی آخری رسومات میں شریک ہوا۔ لوگ اپنے ساتھ پھول، ربن اور رنگ برنگے کپڑے لے کر آ رہے تھے جس سے وہ ان شہیدوں کی قبروں کو سجا رہے تھے۔ جیسے ہی افغانستان میں امریکی اڈے پر ہمارے پہلے اور کامیاب حملے اور کچھ مجاہدین کی شہادت کی خبر پھیلی ہمارے وہ ساتھی جو اب تک نہیں آ سکے تھے، وہ سب جمع ہو گئے اور ہمارے ساتھ افغانستان جانے کی تیاری کرنے لگے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حقانی نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: جب افغانستان میں ہم نے دوبارہ جہاد شروع کر دیا تو عرب اور عراقی مجاہدین بھی ہمارے پاس آنے لگے جن سے ہم انٹیلی جنس کا تبادلہ کرتے تھے اور وہ ہمیں جدید ہتھیار اور دھماکہ خیز مواد مہیا کرتے اور بنانا بھی سیکھاتے تھے۔ انہوں نے خود کش جیکٹ بنانے کی بھی ہمیں تربیت دی جو وہ عراق میں امریکی افواج کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔ امریکیوں کا عراق پر حملہ ہمارے لئے بہت کام کا ثابت ہوا کیونکہ اس سے امریکی افواج کی توجہ بٹ گئی۔ 2004ء سے پہلے ہم لوگ روایتی ہتھیار استعمال کر رہے تھے مثلاً کلاشنکوف اور راکٹ لانچر جو ہم روس کے خلاف بھی استعمال کرتے رہے ہیں۔ مگر 2004ء کے بعد ہماری مزاحمت اور بھی خطرناک صورت اختیار کر گئی جو کہ نئے ہتھیاروں اور ٹیکنیکس کا نتیجہ تھا۔ یہ تربیت ہمیں عرب اور عراقی مجاہدین نے دی تھی، ان کا کہنا تھا کہ اب دنیا میں ہمیں کہیں سے ہتھیار نہیں ملیں گے کیوں کہ پوری دنیا ہم سے لڑنے آگئی ہے، اس لئے ہمیں اپنے ہتھیار خود بنانا پڑیں گے اور ہمیں خطرناک اور بڑے بم بنانے ہوں گے۔ یہ بڑے اور بہتر دھماکہ خیز بم جو کہ سڑک کنارے رکھ کر ہم امریکی قافلوں کو اڑا دیتے تھے یا پھر خود کش حملے میں کام آتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

خان نامی طالبان نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: 2004ء میں ہم نے سنا کہ غزنی کا کنٹرول دوبارہ طالبان کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ میرے دوستوں اور رشتہ داروں نے بتایا کہ رات کے وقت گاؤں میں مسلح طالبان موٹر بائیکوں پر گشت کرتے ہیں۔ اس وقت تک لوگ طالبان کو دیکھنے کو ترس گئے تھے اور امریکی مظالم پر عورتیں جھولیاں پھیلا کر طالبان کو یاد کرتی تھیں۔ جب ہمیں اطلاع ملی کہ رات کو طالبان آتے ہیں تو کئی لوگ تو صرف طالبان کی ایک جھلک دیکھنے اس علاقے میں گئے۔ تھوڑے عرصے بعد مسلح طالبان ہر جگہ نظر آنے لگے۔ پھر ہمیں پہلی دفعہ طالبان نے شب نامہ دیا (یہ ایک کوڈ سوال ہوتا ہے جس کا جواب آپ کو آنا چاہیے۔ رات کے وقت اگر آپ گھر سے باہر نکلیں اور طالبان سے سامنا ہو جائے تو وہ آپ سے شب نامہ سوال پوچھیں گے اور جواب نہیں دینے پر آپ کو دشمن کے شبے میں قتل بھی کیا جا سکتا ہے)۔ طالبان کے خطوط مختلف مساجد، اسکول اور دفتروں میں دیئے گئے جس میں امریکیوں کی مدد کرنے والے کو سخت سزا دینے کا لکھا ہوا تھا۔ طالبان نے پولیس آفسروں، سرکاری آفسروں، مخبروں اور ان نوجوانوں کو ٹارگٹ کرنا شروع کر دیا تھا جو کسی طرح سے بھی افغان حکومت یا امریکی فوج سے منسلک تھے۔ پھر ایک دن آدھی رات کو ہمارے گھر کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میرے گھر والے پریشان ہو گئے کہ کہیں افغان فوجی دوبارہ مجھے اور بھائی کو گرفتار کرنے آگئے ہیں مگر میں نے ہمت کر کے دروازہ کھولا تو سامنے اپنے والد کے ایک شاگرد کو کھڑا پایا جس کے کندھے پر کلاشنکوف لٹکی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے دو اور لڑکے تھے جن کے جسم پر ہتھیار سجے ہوئے تھے۔ یہ 2001ء کے بعد سے پہلا موقع تھا جب میں طالبان کو آمنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ خوشی سے میں رونے لگا اور انہیں چومنے لگا۔ انہوں نے ہمارے ساتھ ہمارے گھر پر رات گزاری صبح کو میں ان کو ساتھ لے کر مسجد چلا گیا جہاں انہوں نے ان لوگوں کے نام لئے جو کسی بھی حوالے سے کرزئی حکومت اور امریکی افواج کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور ان کو خبر دار کیا کہ وہ ان سب کاموں کو چھوڑ دیں۔ اس نے ان سب لوگوں کو ایک ہفتے کا الٹی میٹم دیا اور اگلے ہفتے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

محمد نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: شکست کے بعد جب دوبارہ مجاہدین کے دستے افغانستان میں جانا شروع ہوئے تو وہ پوری طرح سے تربیت یافتہ اور ہتھیاروں سے لیس تھے اور ان کی کمانڈ بھی عرب مجاہدین کر رہے تھے۔ جبکہ افغان مجاہدین کمزور اور بد انتظامی کا شکار تھے۔ مگر آہستہ آہستہ صورتحال بہتر ہونا شروع ہو گئی۔ امریکیوں کی بے رحمانہ بمباری اور کرزئی کرپٹ حکومت کی وجہ سے لوگ دوبارہ سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور ہماری مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا، اس لئے اب ہمیں مزید چھپنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ نے ہمیں معاف کر دیا تھا اور ہمارا خون قبول کر لیا تھا، فرشتے ہماری مدد کو اتر آئے تھے اور مشکل وقت گزر گیا تھا۔ اب ہم نے لوگوں کے سامنے آکر امریکیوں پر حملے کرنے شروع کر دیے تھے۔ جب بھی کسی گائوں والے کی ہم پر نظر پڑتی وہ ہمارے لئے سبز چائے اور کھانے کا انتظام کرنا شروع کر دیتا تھا۔ لوگ ہمیں کھانا کھلائے بغیر اپنے گائوں سے آگے نہیں جانے دیتے تھے اور ہمیں اس طرح عزت دیتے تھے کہ جیسے ہم فرشتے ہوں۔ کرزئی حکومت اور پولیس قیدیوں کی طرح چھپ گئی تھی۔ جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے تھے تو پھر رونا شروع ہو جاتے کہ اللہ نے ہم سے کیا سخت امتحان لیا اور ہم نجانے کیسے اسے پاس کر کے دوبارہ اچھے دور میں داخل ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

یونس نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: " پہلے کچھ حملوں کے بعد ہمیں لگا کہ للہ نے ہمارے اوپر انعامات (پیسوں) کی بارش کر دی ہے، مجھے بتایا گیا کہ گلف اور عرب سے پیسہ پانی کی طرح بہہ کر ہم تک پہنچ رہا ہے۔ لوگ ہمارے ساتھ شامل ہونے کے لئے بے تاب تھے اور مال دولت حد سے زیادہ ہو گیا تھا. ہمارا اصل جہاد 2005ء میں شروع ہوا۔ جلال الدین حقانی کے قبائلی جنگجو ہمارے ساتھ مل کر لڑ رہے تھے کیونکہ امریکی اور پاکستانی فوجوں نے مل کر ان کے بھائی اور رشتہ داروں کو گرفتار کر لیا تھا۔ حقانی نے اپنے بیٹے سراج الدین کو مزاحمت کا حصہ بنایا اور یہیں سے افغان جہاد نے ایک نیا موڑ کاٹا۔ افغانستان کے صوبے پکتیکا، پکتیا اور خوست کے اکثر گائوں میں سمجھا جا رہا تھا کہ طالبان کو شکست ہو چکی ہے اور وہاں کے نوجوان امریکی ملیشیا اور مقامی وار لارڈز میں شامل ہو رہے تھے اور ہماری مخبری کرتے اور ہمارے خلاف لڑتے تھے۔ حقانی کی مدد سے ہم نے کچھ افغانوں کو پکڑا جو امریکی ملیشیا میں کام کر رہے تھے، ان کے گھر والوں کو ڈرا دھمکا کر گائوں چھوڑنے کی ہدایت کی اور آہستہ آہستہ ہمارا کنٹرول بحال ہونا شروع ہو گیا۔ اللہ نے امتحان کے بعد دوبارہ ہمیں فتح دے دی تھی اور علاقے میں دوبارہ طالبان کا پرچم لہرانے لگا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

عزنی کے خان نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: میرے والد کا شاگرد اپنے وعدے کے مطابق ٹھیک ایک ہفتے بعد واپس آیا۔ میں نے اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا اور میں نے اس کو امریکی اتحادیوں کی نشاندہی بھی کر دی۔ میرا ان لوگوں کو مروانا مقصد نہیں تھا بلکہ میں دوبارہ سے اسلامی ریاست کا قیام ،امریکیوں ان کے اتحادیوں اور غداروں سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ 2005ء کے آخر تک غزنی میں طالبان کا مورال بڑھ گیا تھا۔ میری طرح اور بھی مقامی افغان لڑکے اور پاکستانی ہم سے آکر مل رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں ہتھیاروں کی کھیپ ملنا شروع ہو گئی تھی۔ جن میں

RPG's،راکٹس،مائنزاور بم شامل تھے مگر وہ اتنے پرانے اور زنگ آلود تھے کہ استعمال نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ وہ اسلحہ تھا جو کمانڈروں نے روسی دور سے غاروں میں چھپا کر رکھا تھا اور اب اسے نکال رہے تھے۔ میرے گروپ کے پاس تین RPG لانچر تھے اور ایک مارٹر گن تھی، ہر کسی کے پاس بہت کم مقدار میں گولیاں تھیں، ہمارے پاس کچھ روسی مائنز تھیں جو وقت پر صرف 30 فیصد کارآمد تھیں اور ابھی تک ہمارا گروپ بم بنانا نہیں سیکھ سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم امریکی کانوائے پر بہت کم حملہ کرتے تھے، پہلے پہل ہمیں اتنی کامیابی نہیں ملتی تھی کیونکہ ہمارے فائر کیے گئے مارٹر نشانے پر نہیں لگتے تھے مگر ایک فائدہ یہ ہو گیا تھا کہ امریکیوں کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ان کا مقابلہ کرنے والے ابھی باقی ہیں۔ امریکی اور ان کے اتحادی عام لوگوں کو گرفتار کر کے ان پر تشدد اور ہلاک کر کے غلطیاں کر رہے تھے۔ غزنی شہر میں ایک گائوں ہے جس کے رہائشی روس کے دور سے کمیونسٹ ذہن رکھتے ہیں اور امریکیوں سے بغض کے نتیجے میں ہمیں سپورٹ کرتے ہیں۔ پولیس نے اس گائوں میں ریڈ کر دی، مسجد میں گھس کر بزرگوں کو مارا پیٹا اور گرفتار کر کے لے گئے اور الزام یہ لگایا کہ وہ طالبان ہیں۔ پھر ان کو بھاری رقم دے کر پولیس سے چھڑایا گیا۔ اس واقعے کے بعد وہاں کے بزرگوں نے ہمیں خط لکھا جس میں روسی دور حکومت میں مجاہدین کے خلاف کام کرنے پر معافی مانگی گئی تھی اور اب جہاد میں شریک ہونے کا عزم ظاہر کیا گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

آخند زادہ نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: افغان مجاہدین اور طالبان پر بہت سی نظمیں ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح سے مجاہدین نے سنگین حالات میں گائوں دیہاتوں کو آزاد کرایا تھا۔ میں نے اس نظم کو ذہن نشین کر لیا تھا جس سے مجھ میں ایک نیا جذبہ آ گیا تھا اور میری ساری نفسیاتی بیماریاں ختم ہو جاتیں تھیں۔ جیسے جیسے ہماری شہرت کا چرچا ہو رہا تھا، لوگ ہمارے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔ میں بھی اس قابل ہو گیا تھا کہ ایک نیا گروپ تشکیل دے دوں۔ نئے آنے والے زیادہ تر نوجوان تھے وہ پہلے سے موجود طالبان کے مقابلے میں زیادہ پرجوش تھے اور خالی ہاتھوں ہی امریکیوں پر پل پڑنے کو تیار تھے، یہ لوگ نا تو امریکی بموں سے ڈرتے تھے اور نا ہی ان کے جہازوں سے، مگر ہمارے گروپ کے پاس اسلحے اور پیسوں کی کمی تھی۔ اس سلسلے میں، میں نے ملا داداللہ سے رابطہ کیا۔ وہ 2006ء کے شروع میں صرف 30 لڑکوں کے ساتھ ہلمند چلے گئے تھے اور جب وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ 300 کے قریب کمانڈر تھے اور ہر کمانڈر کے ساتھ اس کا ایک دستہ تھا اس کے علاوہ انہوں نے خودکش حملوں کیلئے رضاکاروں کو بھی بھرتی کیا تھا۔ خدا کی قسم ان کی واپسی ایسی تھی جیسے افغانستان میں پانچ برس بعد بارش ہو رہی ہو۔ ملا داداللہ کی آنکھوں کی سرخی بڑھ گئی تھی اور وہ بار بار کہتے تھے کہ اللہ کی قسم ہمارا امتحان پورا ہوا، اب اللہ ہم سے راضی ہو گیا ہے اور ہم امریکیوں کو بتا دیں گے کہ جنگ کیا ہوتی ہے، ہم دوبارہ اسلامی حکومت قائم کر دیں گے۔ میں نے ان کو اپنی ضروریات کی لسٹ دی۔ انہوں نے لسٹ پڑھنے سے پہلے ہی میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا کہ میں زندہ رہوں یا شہید ہو جائوں مگر امریکیوں سے جنگ میری امید سے بھی بڑھ کر ہونی چاہئے، ہم افغانستان کا کنٹرول سنبھالنے کیلئے واپس آ گئے ہیں۔ اگلے دن انہوں نے مجھے بلایا اور اپنی کاپی میں سے ایک صفحہ نکالا اور اس پر کچھ لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ اس پر ایک آدمی کا پتہ لکھا تھا اور مجھے اس سے ملنے کی ہدایت دی گئی تھی، وہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتا تھا۔ میں اس شخص سے ملنے وزیرستان آیا اور اس شخص کو

ڈھونڈا، اس نے ملاداداللہ کا خط دیکھا تو اس خط کو بوسہ دیا۔ پھر دو ہفتے بعد اس شخص نے مجھے مطلوبہ اسلحہ مہیا کر دیا، یہ اتنا ہی تھا جتنا میرے گروپ کو ضرورت تھی۔ ملاداداللہ نے اس طرح کے کافی خط مختلف کمانڈروں کو دیے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

محمد نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: مجھے ایک دفعہ دھماکہ خیز مواد زابل پہچانے کا حکم ملا۔ کسی وجہ سے اس میں ریموٹ کنٹرول ڈیوائس رکھنا بھول گئے۔ پھر مجھے فوری طور پر جو چیزیں رہ گئیں تھیں، انہیں پہچانے کا کہا گیا۔ میں واپس وزیرستان آیا اور پھر میں نے یہ ساری چیزیں سفری بیگ میں کپڑوں اور کتابوں کے درمیان چھپا دیں۔ طورخم پاس پر پاکستانی پولیس نے میرے بیگ کی تلاشی لینا چاہی۔ مجھے پتہ تھا کہ اب میں پکڑا جاؤں گا اس لئے میرا اس وقت دل چاہا کہ میں کہیں بھاگ جاؤں مگر میں بھاگ کر جاتا بھی کہاں۔ میں نے بیگ کی چابیاں دھونڈنی شروع کر دیں پیچھے بہت لمبی قطار لگی ہوئی تھی، پولیس والے نے جنجلاہٹ میں آکر مجھے غصے سے بارڈر کے اس پار دھکیل دیا۔ ایک اور رات میں کابل کے ہوٹل میں تھا اور مجھے ریموٹ کنٹرول ڈیوائس کی ترسیل کا کام سونپا گیا تھا۔ افغان پولیس اور انٹیلی جنس سارے مسافروں کا سامان چیک کر رہی تھی۔ میں اور میرے ساتھیوں نے اپنے بیگ جن میں سامان تھا باتھ روم میں چھپا دیے۔ پولیس نے ہماری جیبوں کی تلاشی لی مگر اللہ نے باتھ روم کی طرف سے ان کو اندھا کر دیا اور وہ وہاں کی تلاشی لئے بغیر چلے گئے۔ اگر وہ یہ سامان ڈھونڈ لیتے تو میری پوری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرتی۔ ان سب واقعات سے ہمارے حوصلے بڑھ گئے اور اپنے رب پر اور بھی پختہ ایمان ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

حقانی نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: 2007ء میں شکست کے بعد میں پہلی دفعہ افغانستان واپس آیا تو دل خوش ہو گیا، طالبان کی حکومت پھر کئی صوبوں میں قائم ہو چکی تھی۔ میں نے جنوبی حصوں کا دورہ کیا اور طالبان کے ترجمان سے بات کی۔ ملا عمر مجھ پر اس سلسلے میں بھروسہ کرتے تھے کہ میں شمالی اور جنوبی حصوں میں لوگوں کا اعتماد حاصل کر کے ان کو جہاد کی دعوت دوں اور مدد کی درخواست کروں۔ صرف اگست کے مہینے میں، میں نے 20 دن میں 8 افغان صوبوں کا دورہ کیا۔ لوگوں کی کرزئی حکومت سے بے رغبتی ہمارے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوئی۔ 2005ء میں لوگوں کا سوچنا تھا کہ کرزئی حکومت کوئی تبدیلی لے کر آئے گی، مگر اب زیادہ تر افغان شہریوں کا ماننا یہ ہے کہ طالبان ہی افغانستان کا مستقبل ہیں۔ دن بدن مزاحمت بڑھتی جا رہی ہے۔ طالبان کا کہنا تھا کہ گھڑیاں بیشک تمہارے پاس ہیں مگر وقت ہمارا چل رہا ہے. ہم یہاں پیدا ہوئے، ہمیں یہیں مرنا ہے، اور ہم کہیں نہیں جا رہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مسیح الدین نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: برگ متل پہاڑ کی چوٹی پر امریکیوں کا ایک بیس تھا جہاں سے وہ ہماری فون کالز اور واکی ٹاکی کی

مانیٹرنگ کرتے تھے اور افغان مخبروں کو بھی ہمارے خلاف استعمال کرتے تھے۔ ہم نے جون میں اس بیس پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ اگر امریکی اوپر سے ہم پر پتھر بھی برسائیں تو ہم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا یہ سن کر سب ساتھی ہنس پڑے مگر اس کی بات میں سچائی بھی شامل تھی۔ ہم نے حملے کا فیصلہ کر لیا اور میں نے ان سے رضاکاروں کو بھرتی کرنے کا کہا جو کہ ہماری مدد کرتے اور زخمیوں کو اسٹریچر اور خچروں کے ذریعے نیچے لے کر جاتے۔ جب ہم نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا تو بہت مشکل پیش آئی کیونکہ ہمارے پاس عام چمڑے کی چپلیں تھیں جو کہ صحیح سے گرپ نہیں کر پا رہیں تھیں اور ساتھیوں کے نیچے گرنے کا خطرہ تھا۔ میں نے اس مشن کو دو ہفتے کیلئے ملتوی کر دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

خان نے اپنی کہانی آگے بڑھاتے ہوئے کہا: امریکیوں سے لڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ 2007ء کی گرمیوں کی ایک رات میرے کمانڈر ملا نوراللہ کو امریکیوں نے ان کے گھر پر ریڈ کر کے شہید کر دیا۔ اس کے علاوہ امریکیوں نے ہمارے 12 مزید کمانڈروں کو بھی شہید کر دیا۔ امریکی اکثر صبح صادق یا رات کے وقت حملہ کرتے تھے۔ ہمیں پتا لگا کہ امریکی ہماری فون کالز کو ٹریس کر کے اور مخبروں کے ذریعے ہمارے ٹھکانوں پر حملے کر رہے ہیں۔ ہم نے موبائل فون کمپنیوں سے شام 6 بجے کے بعد سے ٹرانسمشن بند کرنے کو کہ دیا تا کہ کوئی ہماری مخبری نہ کر سکے۔ ہمیں اب بھی امریکی ہیلی کاپٹروں اور بمبار طیاروں سے خطرہ تھا مگر فون کالز بند کرانے سے رات کے وقت حملوں میں کمی آگئی تھی۔ حملوں میں کمی کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں نے امریکیوں کیلئے مخبری اور ہم سے غداری کرنا چھوڑ دی تھی۔ جبکہ ہمارے آدمی امریکی بیسوں کی 24 گھنٹے نگرانی کر رہے تھے۔ وہ ہمیں امریکیوں کی ہر نقل و حرکت کے بارے میں خبر دیتے تھے۔ پہلے ہم امریکیوں کو سڑک کنارے بم سے نقصان پہنچاتے اور چھپ جاتے تھے مگر اب دھماکے کے فوری بعد ہم اپنی کلاشنکوف اور RPG سے ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ہمارے پاس اب پہلے سے بھی زیادہ خطرناک دھماکہ خیز مواد ہے، ہمیں کھاد کی فراہمی بھی بروقت ہو جاتی ہے جس سے ہم بآسانی بم بنا لیتے ہیں۔ ہمیں جو عربوں نے بم بنانے کی تربیت دی تھی اس سے کہیں بہتر اب ہمارے بم ہیں، جس سے امریکیوں کا زیادہ سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ ہم اپنے بم کو مزید بہتر بناتے رہتے ہیں اور ہمارے ساتھ جو نئے لڑکے آئے ہیں وہ پڑھے لکھے ہیں اور کیمیا بھی جانتے ہیں، وہ بہت زیادہ اچھے بم بناتے ہیں، یہ اللہ کی مدد ہی تو ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حقانی نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: میں مانتا ہوں کہ ہمارے کمانڈر شہید بھی ہوتے ہیں اور پکڑے بھی جاتے ہیں مگر ان سب کے ہوتے ہوئے ہمارے حوصلے پست نہیں ہوئے ہیں۔ ہمارا جہاد ان کمانڈروں سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم باہر کے لوگوں پر انحصار نہیں کرتے جیسے آئی ایس آئی اور القاعدہ۔ میرا خیال یہ ہے کہ القاعدہ کا نام صرف امریکی پروپیگنڈا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مسیح الدین نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: دو ہفتے بعد جمعہ کی نماز کے بعد ہم لوگوں نے چلنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ اپنے ساتھیوں کو پہاڑی پر چڑھنے کی ہدایت کی اور ایک خاص بلندی پر رات گزاری۔ اس رات سردی سے بچنے اور کھانا پکانے کیلئے احتیاط کے طور پر ہم نے آگ بھی نہیں جلائی۔ ہم نے یہ سیکھ لیا تھا کہ امریکی چھوٹی سی آواز پر بھی چوکنے ہو جاتے ہیں۔ صبح سورج نکلنے سے کچھ دیر پہلے میں نے حملے کرنے کیلئے گرین سگنل دے دیا۔ سب سے پہلے قریبی پہاڑیوں پر موجود ہمارے ساتھیوں نے بیس پر مارٹر اور راکٹ برسائے اور سورج نکلنے تک ہم لوگ بیس کی دیوار تک جا پہنچے تھے۔ ہم نے ڈھیر سارے افغان اہلکاروں اور امریکی فوجیوں کو ہلاک کیا۔ جیسے جیسے ہم لڑ رہے تھے ہماری ویڈیو ٹیم اس جنگ کی فلم بھی بنا رہی تھی۔ راکٹ اور مارٹرز نے فوجی اڈے کی اندرونی دیواریں گرا دی تھیں۔ ہم نے ان سے باہر آکر ہتھیار ڈالنے کو کہا مگر کوئی باہر نہیں آیا ہم نے بیس کے ایک طرف آگ لگا دی اور دوسری طرف چلے گئے تاکہ دھوئیں سے بچنے کیلئے جو فوجی باہر نکلیں ان کو ہم پکڑ سکیں۔ اس کارروائی میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس کے بعد امریکی ہیلی کاپٹر آ گئے اور انہوں نے راکٹوں اور مشین گنوں سے ہم پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے ہمارے 12 ساتھی شہید ہو گئے۔ ہم اپنی طاقت کا امریکہ سے موازنہ نہیں کر سکتے مگر ہم ان سے بچنے کیلئے پہاڑوں اور پتھروں کے پیچھے پناہ ضرور لے سکتے ہیں۔ ان کی بھرپور طاقت کے باوجود ہم نے ان کو وہ بیس خالی کرنے پر مجبور کر دیا اور خود اس بیس پر قبضہ کر لیا۔ میں نے خود دیکھا کہ اس بیس میں امریکی فوجیوں کی جلی ہوئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں، مگر میں نے اپنے ساتھیوں کو منع کیا کہ کسی بھی لاش کو خراب مت کریں کیونکہ اس سے اللہ کی مدد چلی جائے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

یونس نے اپنی کہانی اس طرح آگے بڑھائی: جب میرے چھوٹے بھائی کی شادی ہوئی تو میری ماں نے مجھ سے پوچھا کہ میں شادی کب کر رہا ہوں تو میں نے ماں کو جواب دیا کہ جس وقت تک کابل میں دوبارہ اسلامی حکومت قائم نہیں ہو جاتی، میں شادی نہیں کروں گا بلکہ جہاد کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ وقت ابھی دور ہے مگر یہ ہو گا ضرور۔

امریکی طالبان کو ڈالروں کا لالچ دے کر جہاد چھوڑنے کیلئے کہتے ہیں، یہ ایک تضحیک آمیز بات ہے۔ ایک برس پہلے میری منگنی ہوئی مگر میرے پاس مہر میں دینے کیلئے 1500 ڈالر نہیں ہیں اور لڑکی کے باپ کے پاس شادی کیلئے 500 ڈالر نہیں ہیں تاکہ وہ شادی کی تیاری مکمل کر سکے۔ جب اس سے سوال کیا گیا کہ تم سے کون شادی کرے گا تو وہ بڑا حیران ہوا اور بتایا کہ لوگ طالبان کو اپنی بیٹیاں دیتے ہوئے بلکل نہیں گھبراتے اور ان کو یہ بھی پتا ہوتا ہے کہ جس سے وہ اپنی بہن یا بیٹی بیاہ رہے ہیں وہ ایک دو ہفتے یا مہینے میں شہید ہو جائے گا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح ہمیں بھی جہاد میں شریک ہونے کا موقع مل جائے گا۔ طالبان بننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ نے ایک آگ کا لباس پہن لیا ہے۔ آپ کو اس کیلئے اپنا گھر بار چھوڑنا پڑتا ہے اور یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی پڑتی ہے کہ کسی بھی وقت آپ مر سکتے ہیں۔ امریکی آپ کو گرفتار کر کے بگرام اور گوانتانامو بے کی جیلوں میں کتوں کے آگے بھی ڈال سکتے ہیں۔ آپ کو اس بات کا بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ آپ کو کسی بھی وقت زخمی ہونے کی صورت میں علاج

بھی کرانا پڑ جائے۔ جب میں یہ باتیں نئے بھرتی ہونے والوں کو بتاتا تھا تو وہ خوشی سے آگ کا لباس پہننے کو تیار ہو جاتے تھے اور یہ سب اسی چیز کا نتیجہ ہے کہ میرا ایمان پختہ ہو گیا ہے کہ جنگ ہم ہی جیتیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆

محمد نے اپنی کہانی اس طرح ختم کی: ہم کبھی بھی ٹائم کی پرواہ نہیں کرتے۔ ہم جنگ کو جیتنے تک لڑتے ہیں چاہے جتنا بھی وقت لگ جائے۔ امریکیوں کے پاس جدید اسلحہ ہے مگر ہم نے لمبی اور تھکا دینے والی جہاد کی تربیت لی ہے۔ ہم یہاں پیدا ہوئے، ہمیں یہیں مرنا ہے اور ہم یہاں سے کہیں نہیں جارہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مسیح الدین نے اپنی بات اس طرح ختم کی: جنوب کی طرف طالبان نے اوبامہ کیلئے نئے محاذ کھول دیے ہیں اور مجاہدین وہاں پر دھماکہ خیز مواد بڑی مقدار میں استعمال کر رہے ہیں۔ مگر ہم کنڑ اور نورستان والے اس معاملے میں خوش قسمت ہیں یہاں پہاڑ، جنگل اور درخت ہماری حفاظت کرتے ہیں اور امریکی ہمیں یہاں آسانی سے نہیں ڈھونڈ سکتے۔ دو تین برس پہلے امریکی فوجی یہاں اس طرح رہتے تھے جیسے چھٹیوں پر آئے ہوں۔ وہ ایک دوسرے کی ویڈیوز اور تصویریں بناتے ہوئے ان پہاڑوں پر آزادانہ گھومتے تھے اور کھلے میدان میں گیمز کھیلتے تھے۔ مگر اب امریکیوں کے وہ دن گئے اور ان کو اس بات پر مجبور کر دیا گیا ہے کہ 24 گھنٹے ان کی انگلی ٹریگر پر رہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

آخند زادہ نے اپنی بات اس طرح ختم کی: بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب ایک خواب کی طرح تھا اور اس فتح تک میری ڈاڑھی سفید ہو جاتی مگر اللہ نے میری ڈاڑھی سفید ہونے سے قبل ہی وہ خواب پورا کر دیا۔ دن بدن ہم مضبوط ہوتے جا رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆